عائشہ حمید
پی ایچ ڈی سکالر،نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز ، اسلام آباد

خواتین اہلِ قلم کی آپ بیتیاں

Aysha Hameed

Ph.D Scholar,National University of Modern Languages, Islamabad

Autobiographies of Female Urdu Writers

Autobiography is the complete representation of personality. In Urdu literature we found many scatter shapes of autobiographies. Women writers also adopted this style of self expression and expressed their experiences through it. This article is based on documentary research. In this research work, Autobiographies of seven female writers are viewed and critically analyzed. In Urdu criticism, there is scarcity of evaluation work on women writers .This article analyzes the autobiographies of some women writers which not only represent their personal life and struggle but also critically discusses their literary work. This article can be a best addition to view the feelings, problems and status of women writers in Pakistani Society.

ادب تنقیدِ حیات ہی کا نہیں اظہارِ ذات کا بھی اہم وسیلہ ہے۔تخلیق کار ناول لکھے یا افسانہ یا پھر کسی بھی صنف میں طبع آزمائی کرے اس میں اُس کی ذات کی جھلک فطری طور پر موجود رہتی ہے۔ان کے علاوہ کچھ اصناف ایسی بھی ہیں جن میں مصنف کی ذات براہِ راست موضوع بنتی ہے۔خطوط،روزنامچے،سفرنامے اور رپورتاژ جیسی اصناف تخلیق کار کی ذات اور اس کے احساسات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں لیکن آپ بیتی واحد صنف ہے جس میں اظہارِ ذات کی کامل ترجمانی ممکن ہے۔

اُردو ادب میں خودنوشت سوانح عمری کی ابتدائی صورتیں تزوکات شاہی، تذکرہ نگاری، خطوط، سفرناموں اور مثنویوں میں منتشر صورت میں موجود ہیں۔انیسویں صدی کے نصف آخر میں آپ بیتی اُردو ادب میں بطور صنف متعارف

ہوئی۔ایک عرصے تک جعفر تھانسیری کی آپ بیتی ''تواریخ نجیب''المعروف کالا پانی (۱۸۸۵ء) کواُردو کی پہلی آپ بیتی قرار دیا جاتا رہا ہے لیکن بعد میں تحقیق کے ذریعے یہ بات سامنے آئی کہ شہر بانو بیگم کی آپ بیتی ''بیتی کہانی'' اورنواب صدیق حسن کی خودنوشت ''القاالمن بالقاالمحن'' بھی ۱۸۸۵ء کی تصنیف کردہ ہیں جب کہ محمد جعفر تھانسیری کی آپ بیتی میں موجود ایک درونی شہادت یہ واضح کرتی ہے کہ یہ کتاب ۱۸۸۸ء میں شائع ہوئی اگر چہ اس کا سالِ تصنیف ۱۸۸۵ء ہے۔(۱) ڈاکٹر معین الدین عقیل کی تحقیقی کاوشوں کے سبب سیّد رجب علی خان کی ایک غیر مطبوعہ آپ بیتی دریافت ہوئی جو ۱۸۶۸ء کی تصنیف شدہ ہے اور انہی کی تحقیق کے مطابق اُردو کی سب سے قدیم ترین مطبوعہ آپ بیتی پتمبر سنگھ کی خودنوشت ''آپ بیتی'' ہے جو ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی۔(۲) ان ابتدائی خودنوشتوں کے بعد آپ بیتی کی صنف نے اپنا ارتقائی سفر جاری رکھا ہے اور آج عہدِ حاضر میں اس صنف میں بڑے اہم اضافے ہو چکے ہیں۔قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ''، سر رضا علی کی ''اعمال نامہ''، جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات''، جاوید اقبال کی ''اپنا گریباں چاک'' جیسی آپ بیتیوں نے اُردو ادب کو اظہارِ ذات کے متنوع اور نادر نمونے فراہم کیے ہیں۔

خواتین تخلیق کاروں نے بھی ابتدا ہی سے اس صنفِ نثر میں اپنا حصہ ملایا اور اپنی ذات کے دریچوں کو آپ بیتی کی صورت میں وا کیا۔شہر بانو بیگم کی ''بیتی کہانی'' اُردو ادب میں خواتین کی اوّلین آپ بیتی ہے۔یہ آپ بیتی پہلی مرتبہ ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی۔اس کی دوسری اشاعت ۱۹۹۵ء میں ڈاکٹر معین الدین عقیل کی کوششوں سے منظر عام پر آئی۔شہر بانو بیگم ریاست پاٹودی کے نواب اکبر علی خان کی صاحب زادی تھیں۔انہوں نے یہ آپ بیتی ایک انگریز خاتون مس فلیچر کی ترغیب پر لکھی۔اس کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ آپ بیتی مس فلیچر کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہے۔اس آپ بیتی کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔آغاز میں خاندانِ پاٹودی اور ریاست پاٹودی کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔دوسرے حصے میں مصنفہ نے اپنے بچپن سے لے کر عملی زندگی تک کے احوال کو پیش کیا ہے۔یہ آپ بیتی موضوعاتی اعتبار ہی سے نہیں فنی اعتبار سے بھی اہم ہے۔شہر بانو نے غیر ضروری واقعات کے بیان سے اپنی آپ بیتی کو بوجھل بنانے کے بجائے اختصار و جامعیت سے کام لیا ہے۔ان کا اسلوبِ بیان بھی انتہائی سادہ ہے البتہ بعض پیراگرافوں میں مسجع و مقفّیٰ انداز بھی اختیار کیا گیا ہے لیکن اس سے واقعات کی تفہیم میں کسی قسم کا اُلجھاؤ پیدا نہیں ہوتا۔شہر بانو بیگم نے دِلّی کے روزمرہ اور محاورے کو بڑے خوب صورت پیرائے میں استعمال کیا ہے۔یہ آپ بیتی اپنے موضوع اور فن کے اعتبار سے خواتین کی آپ بیتیوں میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔شہر بانو کا تعلق چونکہ برصغیر کی ایک ریاست کے نواب گھرانے سے تھا اس لیے وہ خطے میں ہونے والے سیاسی، سماجی اور تہذیبی تغیرات سے اچھے طریقے سے آگاہ تھیں یہی وجہ ہے کہ ''بیتی کہانی'' میں شہر بانو کے ذاتی حالات کے ساتھ تاریخی اور تہذیبی جھلکیاں بھی موجود ہیں۔

''کاغذی ہے پیرہن'' اُردو کی معروف افسانہ نگار عصمت چغتائی کی آپ بیتی ہے۔عصمت نے اپنی آپ بیتی کے ذریعے اپنی شخصیت کے تشکیلی مراحل پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔وہ اگر چہ ایک روایت پسند مشرقی گھرانے سے تعلق رکھتی

تھیں لیکن انہوں نے روایات کو کبھی اپنے پاؤں کی زنجیر نہیں بننے دیا۔ انہوں نے اس وقت اعلیٰ تعلیم حاصل کی جب بچیوں کو انگریزی تعلیم دلوانا انتہائی بُرا سمجھا جاتا تھا۔ عصمت تعلیمِ نسواں مخالف روّیوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

تمام ملنے والوں کی یہی رائے تھی کہ لڑکیوں کو تعلیم دلوانی انہیں پیشہ کرانے سے زیادہ ذلیل حرکت ہے۔ (۳)

عصمت نے اس ماحول کے باوجود نہ صرف تعلیم حاصل کی بلکہ ملازمت بھی کی۔ وہ اسلام، ہندومت، عیسائیت اور یہودیت کا بڑا گہرا مطالعہ رکھتی تھیں۔ انہوں نے مذہب کو ہمیشہ انسانی قدروں کے تناظر میں دیکھا۔ وہ ہندوؤں اور عیسائیوں کے تہواروں میں بھی شریک ہوتی تھیں۔ عصمت ہر سطح پر ایک غیر روایتی ذہن کی حامل ضدی، روایت شکن اور اَنا پرست عورت کے روپ میں سامنے آتی ہیں جسے اپنی ذات پر کامل بھروسہ ہے۔ وہ سچ کی سزا جانتے ہوئے بھی سچ بولنے سے نہیں گھبراتیں۔ ''کاغذی ہے پیراہن'' میں خاندانی معاملات اور قریبی رشتوں سے جڑے مختلف واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنے بھائی عظیم چغتائی کی زندگی اور عادات واطوار کو اپنی آپ بیتی میں محفوظ کر دیا۔ ان کے والد مرزا قسیم بیگ ڈپٹی کلکٹر تھے۔ انہیں اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے مختلف علاقوں میں اقامت اختیار کرنا پڑی اس لیے عصمت اور پورا خاندان والد کے تبادلے کے ساتھ دوسرے علاقے میں منتقل ہو جاتا۔ عصمت چغتائی نے اپنے عمیق مشاہدے کی بدولت ان خطوں کے رسوم ورواج اور روایات کو ''کاغذی ہے پیراہن'' کا حصہ بنا دیا ہے اس لیے اس آپ بیتی کے کچھ ٹکڑے سفرنامے کے اجزاء معلوم ہوتے ہیں۔ جودھ پور کے رسوم ورواج بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> مارواڑی خواتین کا لباس نہایت بھڑک دار رنگ کا ہوتا ہے۔ مہینوں رنگ گھلا رہتا تھا۔ ایک جوڑا جب تک تار تار نہ ہو جاتا بدلا نہیں جاتا تھا۔ عورتیں تال پر جا کر کپڑے اُتار کر دھوتیں اور ریت پر پھیلا دیتیں۔ مرد گزرتے تو پلٹ کر نہ دیکھتے، نہ عورتوں کو رتی بھر پروا ہوتی..... مارواڑ میں عورتوں کے بال بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس چوٹی پر کلاوہ یا کالا ڈورا خوب کس کر لپیٹا جاتا ہے اور سونٹا سا بنا لیا جاتا ہے۔ ایک بال بھی ہفتہ یا دو ہفتہ باہر نہیں نکلتا۔ پھر جب بدبو ناقابل برداشت ہو جاتی اور سر میں جوئیں کلبلانے لگتیں تو نہان ہوتا۔ (۴)

عصمت چغتائی لفظوں کے برمحل استعمال سے اپنے مطالب و مفاہیم کے بیان کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں۔ عورتوں کی زبان، محاورے اور مکالمے کا خوب صورت استعمال ان کے اسلوب کی اضافی خوبی ہے۔ ''کاغذی ہے پیراہن'' ایک ایسی آپ بیتی ہے جس میں آپ بیتی، خاکہ نگاری، ڈراما نگاری، سفرنامے اور افسانے کی خصوصیات جمع ہوگئی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے یہ ساری اصناف اس کتاب میں ٹکڑوں کی صورت میں موجود ہیں جن کے باہمی استعمال میں کسی منطقی اور زمانی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ ایسا لگتا ہے جیسے عصمت نے اپنی یادداشتوں کو جمع کر کے آپ بیتی کا نام دے دیا ہے۔ تمام تر خصوصیات کے باوجود زمانی ترتیب اور منطقی ربط نہ ہونے کی وجہ سے اس آپ بیتی کو پڑھتے ہوئے ایک کسک موجود رہتی ہے۔

ادا جعفری اُردو شاعری کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔ انہوں نے اپنی خودنوشت ''جو رہی سو بے خبری رہی'' کے عنوان سے تحریر کی ہے جو کہ ۱۹۹۵ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس آپ بیتی کا عنوان سراج الدین اورنگ آبادی کے شعر کے آخری حصے سے لیا گیا ہے۔

خبر تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

ابتدا میں یہ آپ بیتی رسالہ ''افکار'' میں چھپتی رہی۔اس کے بعد ۱۹۹۵ء میں کتابی صورت میں منظرِ عام پر آئی۔اس آپ بیتی کو کل ۲۹ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ابتدائی چھ ابواب مصنفہ کے خاندانی حالات اور پس منظر پر مشتمل ہیں۔آدا نے خاندانی روایات کے ساتھ ٹونک اور بدایوں کی تہذیبی اقدار اور روایات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔اس کے بعد انہوں نے اپنی عملی و ادبی مصروفیات کی وضاحت کی ہے۔اس آپ بیتی کے ذریعے ہم آدا کی ادبی زندگی کے ارتقائی سفر کا بغور مطالعہ کر سکتے ہیں۔اس آپ بیتی سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے نو سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور ان کا پہلا شعری مجموعہ ''شہرِ درد'' ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔

قیامِ پاکستان کے بعد ہونے والے سماجی، تہذیبی اور سیاسی تغیرات کی جھلکیاں بھی اس خودنوشت کا حصہ ہیں۔ ایک شاعرہ ہونے کی حیثیت سے ادا کے ادبی و دوستانوی مراسم کا احوال بھی ملتا ہے۔اس سلسلے میں ممتاز مفتی، نثار عزیز بٹ، سیّد ضمیر جعفری، کرنل محمد خان، شفیق الرحمٰن اور مختار مسعود کے نام نمایاں ہیں۔ادا جعفری نے مذکورہ شخصیات کی لفظی تصویر کشی کرتے ہوئے ایسے خاکے ترتیب دیے ہیں جن کے ذریعے ان کی شخصیت کا عمومی تاثر واضح ہوتا ہے۔ادا جعفری کی یہ آپ بیتی حسن و توازن اور تربیت کے لحاظ سے خواتین کی آپ بیتیوں میں سے ایک اچھی مثال ہے۔اس آپ بیتی کے مطالعے سے ہماری ملاقات ایک ایسی شخصیت سے ہوتی ہے جو اعلیٰ ترین تہذیبی اقدار و روایات اور شرافت و شائستگی کی نہ صرف پروردہ ہے بلکہ شارح اور امین بھی ہے۔

ادا کو مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کا موقع بھی ملا وہ جس ملک بھی گئیں وہاں کی تہذیبی روایات اور ان سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار ضرور کرتی ہیں۔انہوں نے سیاحتی علاقوں کی لائبریریوں اور تاریخی مقامات کا ذکر بھی کیا ہے جو کہ قارئین کے لیے دلچسپی اور معلومات میں اضافے کا باعث ہے۔''جو رہی سو بے خبری رہی'' کا اندازِ بیان شاعرانہ ہے۔ادا کی تحریر ایک لطیف نغمگی میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے لیکن یہ شاعرانہ نثر ان کے اندازِ بیان کی خامی نہیں بنتی بلکہ ان کے مفاہیم کی بھرپور ترسیل کا کام کرتی نظر آتی ہے۔ادا جعفری ایک مثبت فکر و شعور کی حامل شخصیت ہیں جو زندگی کے دکھوں کا رونا رونے کے بجائے مثبت پہلوؤں کو اُجاگر کرتی دکھائی دیتی ہیں۔پوری آپ بیتی میں انہوں نے کسی شخصیت کا گلہ شکوہ نہیں کیا اور اس کی انہوں نے بڑی خوب صورت دلیل پیش کی ہے:

> ایسا نہیں تھا کہ مجھے کبھی کسی سے دکھ نہ پہنچا ہو، دوستوں کے علاوہ بہت سے لوگوں سے واسطہ رہتا ہے مگر جن باتوں نے دل دکھایا انہیں اپنی یادوں میں کیوں شریک رکھا جائے۔یہ زندگی بہت مختصر ہے اور عفو و درگزر میرے مولا کی صفت ہے اور اسے پسند ہے۔(۵)

کشور ناہید معروف شاعر، نقاد، محقق اور کالم نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک آپ بیتی نگار بھی ہیں۔انہوں نے اپنی خودنوشت ''بُری عورت کی کتھا'' کے ذریعے اپنی زندگی کے تجربات و مشاہدات کو قارئین کے لیے محفوظ بنا دیا ہے جس کا احاطہ

کرنا کسی سوانح نگار کے بس کا کام نہ تھا۔کشور کی یہ آپ بیتی کل چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں انہوں نے خاندانی پس منظر اور آبائی شہروں کا تعارف کروایا ہے۔کشور ایک روایت پسند خاندان میں پیدا ہوئیں جہاں لڑکی کی پیدائش ہی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ایسے خاندان میں تعلیم، ملازمت اور شاعری جیسے شغل کی گنجائش موجود نہ تھی۔کشور نے تمام روایتی قدغنوں اور بندھنوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی زندگی کی راہیں ترتیب دیں۔وہ پہلی مرتبہ جب مشاعرہ پڑھ کر واپس آئیں تو گھر والوں کی طرف سے ایسے جملے سننے کو ملے:

آ گئی خاندان بھر کا نام اچھال کے، مجھے پتا ہوتا کہ تو ایسی اُٹھے گی تو پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتی۔(۶)

کشور نے اپنی راہ میں کسی رکاوٹ کو حائل نہ ہونے دیا اور آگے بڑھتی رہیں۔آج وہ اُردو ادب کا ایسا معتبر حوالہ ہیں جن کے سامنے بڑے بڑے نقاد سنبھل کر بولتے ہیں۔''بُری عورت کی کتھا'' ان کی زندگی کے تمام مراحل کی خوب صورت اور مستند دستاویز ہے جس میں ایک ایسی عورت اپنی شناخت کی دوڑ دھوپ میں مصروف نظر آتی ہے جس پر چہار جانب سے طنز وتشنیع کے نشتر چلائے جا رہے ہوں لیکن وہ ثابت قدمی کے ساتھ رو بہ منزل ہو۔کشور نے اپنی زندگی کے اہم فیصلے یعنی شادی کے متعلق بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ یوسف کامران سے پسند کی شادی نے انہیں دیگر رشتوں کے ساتھ خود یوسف سے بھی جدا کر دیا۔کشور اپنی ذاتی محرومیوں کو مجموعی معاشرتی صورتِ حال پر منطبق کرتی ہیں اور یہ واضح کرتی ہیں کہ ہر طبقے کا مرد عورت کا استحصال کرتا ہے۔اس کے سامنے صرف عورت کا جنسی پہلو ہوتا ہے۔وہ عورت کی شخصیت اور صلاحیتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ کشور ناہید نے اپنی ذات کے دائرے میں رہتے ہوئے معاشرتی خرابیوں اور عورتوں کے استحصال کی نشان دہی کی۔ یہ خیالات ان مشرقی عورتوں کی آواز بن جاتے ہیں جن کی زبانوں پر سماجی قدروں کے قفل لگے ہوئے ہیں۔کشور نے زندگی کی تمام کڑوی سچائیوں کو بلا جھجک پیش کیا ہے بلکہ اس خودنوشت میں ان کے ذاتی واقعات اور سچائیوں کا بیان بھی ملتا ہے۔''بُری عورت کی کتھا'' کا اسلوب کشور کے صاحبِ طرز نثر نگار ہونے کی بھی دلیل ہے۔

قرۃ العین حیدر اُردو کی ایسی ادیبہ ہیں جن کی تحریروں میں شخصیت کی پیش کش کا عنصر دیگر ادیبوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں بھی ذاتی فکر و ماحول کو فکشن کے پردے میں پیش کیا ہے اس کے باوجود انہوں نے تین جلدوں پر مشتمل ضخیم خودنوشت ''کارِ جہاں دراز ہے'' تحریر کی ہے۔اس خودنوشت میں قرۃ العین حیدر نے اپنی تہذیبی یافت کے لیے صدیوں ماضی میں سفر کیا ہے۔انہوں نے اپنے خاندانی پس منظر کا آغاز آٹھویں صدی عیسوی سے کیا ہے۔اس طرح انہوں نے اپنے خاندان کی مختلف علاقوں میں ہجرت اور تہذیبی تغیرات کو جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے۔جلد اوّل میں آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے احوال پیش کیے گئے ہیں۔قرۃ العین حیدر کے ایک بزرگ میر احمد علی برٹش آرمی میں ملازم تھے اس لیے انہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے واقعات کو اپنی خودنوشت کا حصہ بنایا ہے۔اسی صدی کا کثیر حصہ قرۃ العین حیدر کے والد سجاد حیدر یلدرم اور والدہ نذر سجاد کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد قیامِ پاکستان کے آغاز سے شروع ہوتی ہے۔اس جلد میں قرۃ العین حیدر کے ذاتی حالات و واقعات اور ادبی و تخلیقی سفر کا بیان

ملتا ہے۔تیسری جلد میں بھی زیادہ تر ادبی محافل اور شعراء واد باء سے ملاقاتوں کا احوال مرقوم ہے۔

''کارِ جہاں دراز ہے'' موضوعات اور فن کے اعتبار سے ایک خاصے کی چیز ہے۔عام طور پر آپ بیتی میں مصنف کی ذات مرکزی حیثیت رکھتی ہے جب کہ اس سے جڑے ہوئے واقعات اور عوامل ضمنی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں جو آپ بیتی کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں لیکن ''کارِ جہاں دراز ہے'' میں بیک وقت کئی شخصیات مرکزی حیثیت رکھتی ہیں اس کے علاوہ ایک نسل کا صدیوں پر مشتمل تہذیبی سفر بہت اہمیت کا حامل ہے۔گویا انہوں نے ایک خاندان کو لے کر برصغیر کی تاریخ و تہذیب کو پیش کیا ہے۔قرۃ العین حیدر نے آپ بیتی کے مروّجہ فنی طریقۂ کار کی پیروی نہیں کی۔اس کو پڑھتے ہوئے بیک وقت ڈراما، افسانہ، ناول، خودنوشت اور تہذیبی دستاویز کا گمان ہوتا ہے۔''کارِ جہاں دراز ہے'' کے تعارف سے اس تصنیف کی جہتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> موجودہ داستان مغربی ایشیا سے ہندوستان پہنچ کر اس عہدِ دلاوری میں شروع ہوتی ہے لیکن عمرانی لحاظ سے یہ زمانہ اس لیے اہم ہے کہ اس وقت سے ہماری مخلوط تہذیب اور زبان وادب کی داغ بیل پڑنا شروع ہوئی تھی۔(۷)

وسیع زمانی تناظر رکھنے والی اس تہذیبی و تاریخی داستان کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔بغداد کی گلیوں سے شروع ہونے والی یہ کہانی وسط ایشیا، برصغیر پاک و ہند کے قصبوں اور شہروں سے ہوتی ہوئی یورپ اور مشرقِ وسطیٰ تک جا پہنچتی ہے۔ اتنے متنوع اور وسیع مکانی حدود کے سیاسی، سماجی، لسانی، جغرافیائی، مذہبی اور تہذیبی پس منظر کو سمجھنا اور فن کاری سے پیش کرنا کوئی آسان کام نہ تھی لیکن قرۃ العین حیدر نے ''کارِ جہاں دراز ہے'' میں یہ اجتہادی کارنامہ کر دکھایا ہے۔

''بچھڑے لمحے'' ناول نگار رضیہ بٹ کی خودنوشت سوانح عمری ہے جو ۲۰۰۴ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوئی۔اس سے قبل اس آپ بیتی کا کچھ حصہ روزنامہ ''نوائے وقت'' میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔رضیہ بٹ نے اس آپ بیتی میں اپنے بچپن، خاندانی ماحول، تعلیمی مدارج اور ادبی سفر کو مکمل جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔رضیہ کے والدین اگرچہ ادیب نہ تھے لیکن اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے رضیہ بٹ کی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار پر کسی قسم کی پابندی نہ لگائی بلکہ ہر موقع پر ان کی حوصلہ افزائی کی۔اس آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ رضیہ نے سب سے پہلی کہانی ''لغزش'' لکھی جو لاہور کے ایک رسالے میں شائع ہوئی جس پر بعد میں انہوں نے ناول ''نائلہ'' لکھا۔رضیہ کو اپنے والد کے کاروبار اور خاوند کی ملازمت کی بدولت مختلف شہروں میں قیام کا موقع ملا۔رضیہ نے ان تمام شہروں کی تہذیبی زندگی، رسوم و رواج اور تاریخی مقامات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔پشاور میں شادی اور فوتیدگی کی رسموں کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> پشاور میں تب شادی اور مرگ کی بھی اپنی ہی رسمیں اور روایات تھیں۔خاندان یا ملنے والوں کے ہاں فوتیدگی ہو جاتی ہے تو عورتیں عام طور پر نئے کپڑے پہن کر جاتیں۔نئی بیاہتا عورتیں تو کامدانی کپڑوں کے ساتھ زیور بھی پہنتیں۔مرگ والے گھر میں قیام دو تین دن ضرور ہوتا۔چالیسویں تک تو آنا جانا لگا ہی رہتا۔قہوے اور چائے کا دور دن رات چلتا، کھانے کی دیگیں اُترتیں، بالکل شادی بیاہ کا سماں ہوتا۔(۸)

رضیہ بٹ نے ''بچھڑے لمحے'' میں تہذیبی ، سماجی اور معاشرتی عکاسی کے ساتھ سیاسی منظر نامے کو بھی پیش کیا ہے۔انہوں نے پشاور میں مسلم لیگ خواتین ونگ کا قیام، ۱۹۴۶ء کے ریفرنڈم ، قیامِ پاکستان اور ہجرت کے واقعات کو جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔رضیہ بٹ تقسیمِ ہند کے وقت جنم لینے والے فسادات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> انسان وحشی اور حیوان بن گیا تھا۔پہل ہندوستان سے ہوئی اور اس کا ردِعمل یہاں بھی ہوا،مسلمان بھی بپھر گئے، پھنکار اُٹھے، ہندوؤں اور سکھوں سے اپنے بھائی بندوں کے بدلے لیے۔لاشیں یہاں بھی بکھریں،خون یہاں بھی بہا۔(۹)

رضیہ نے اپنی آپ بیتی میں تمام رشتوں کا بڑی محبت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ان کی زندگی کا ہر روپ بہت دل کش ہے۔وہ ایک فرمانبرداری بیٹی،محبت کرنے والی بہن، وفاشعار بیوی، انتہائی شفیق ماں اور انسان وانسانیت سے محبت کرنے والی ایک عورت کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔''بچھڑے لمحے'' ایک تخلیق کار کے ذہنی ارتقا اور مختلف رشتوں سے جڑے احوال وواقعات کی دستاویز ہے۔رضیہ بٹ نے انتہائی مہارت کے ساتھ واقعات، حالات اور کرداروں کے مطابق زبان کا استعمال کیا ہے۔ان کی مکالمہ نگاری میں موجودگی برجستگی اور بے ساختگی کا عنصر نہ صرف عبارت کے حسن میں اضافہ کرتا ہے بلکہ اس سے انہوں نے مختلف شخصیات کے مزاج کی تصویر کشی کا اہم فریضہ بھی انجام دیا ہے۔

''گئے دنوں کا سراغ'' اُردو ناول نگاری میں منفرد شناخت کی حامل ادیبہ نثار عزیز بٹ کی خودنوشت سوانح عمری ہے جو ۲۰۰۴ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوئی۔نثار نے آپ بیتی کے ابتدائی حصے میں خاندانی پس منظر کا ذکر کیا ہے۔ ان کا تعلق اگرچہ ایک معتدل خیال گھرانے سے تھا لیکن اس کے باوجود لڑکی کی پیدائش پر کوئی اچھا تاثر نہیں دیا جاتا تھا:

> میرے نانا نانی کے آنگن میں مجھ سے پہلے سات لڑکیاں پیدا ہو چکی تھی اور لڑکی پیدا ہونے پر وہاں باقاعدہ آہ وفغاں کی آوازیں بلند ہوا کرتی تھیں۔(۱۰)

نثار کو تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے میں بھی خاصی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ وہ ایک عبوری عہد تھا۔جب لڑکیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ان تمام حالات کے باوجود نثار عزیز بٹ نے اعلیٰ تعلیم کی منازل طے کیں۔ آپ بیتی اگرچہ فردِ واحد کے حالات وواقعات اور تجربات کا عکس ہوتی ہے لیکن اس میں ایک عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی ماحول کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔''گئے دنوں کا سراغ'' میں قیامِ پاکستان اور ہجرت و وفسادات جیسے اہم واقعات کا حوالہ ملتا ہے لیکن ان واقعات کے بیان میں مصنفہ نے کسی قسم کی جذباتی وابستگی کا اظہار نہیں کیا اس کی بڑی وجہ کانگرس سے ان کی وابستگی ہے:

> جب مسلم لیگ اور کانگرس کی کش مکش شروع ہوئی تو میں نے کانگرس کی طرف داری جاری رکھی۔ ہمارا سارا کالج کٹر مسلم لیگی تھا۔میری ہم خیال مشکل سے دو چار لڑکیاں ہوں گی یا پھر مس ٹھاکر داس تھیں۔(۱۱)

نثار عزیز نے ایک بھرپور زندگی گزاری ہے۔انہوں نے اپنی آپ بیتی میں مختلف ممالک کے سفر، وہاں کے تقریبات اور ملنے والی شخصیات کا تفصیلاً ذکر کیا ہے جن کو یاد رکھنا اور ان سے جڑے ہوئے واقعات کو ذہن نشین رکھنا آسان نہیں رہتا۔بھرپور ضخامت کے باوجود اس آپ بیتی میں زمانی ترتیب کا خصوصی لحاظ معاشرتی وتہذیبی تغیرات بھی موجود ہیں۔

تقسیم کا مرحلہ ہو یا ہجرت کے دل دوز واقعات، سانحہ مشرقی پاکستان ہو یا ضیاء الحق کا تاریک مارشل لائی عہد اس خودنوشت کا حصہ ہیں۔ ''گئے دنوں کا سراغ'' نثار عزیز بٹ کی زندگی اور ادبی سفر کو سمجھنے کے لیے ایک انتہائی اہم دستاویز ہے۔ یہ آپ بیتی موضوعی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس میں ایک باشعور، باعمل اور ذہین عورت زندگی کی عملی جدوجہد کرتی نظر آتی ہے البتہ واقعات کا غیر مربوط بیان کھٹکتا ہے۔ اس آپ بیتی کا اسلوب سادہ، رواں اور دلچسپ ہے جس میں کسی قسم کا ابہام یا جھول محسوس نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں انہیں اپنی ڈائریوں سے خاصی مدد ملی ہے۔

معروف ترقی پسند سجاد ظہیر کی صاحب زادی نور سجاد نے ''میرے حصے کی روشنائی'' کے نام سے آپ بیتی تحریر کی ہے۔ یہ آپ بیتی نور سجاد کی زندگی کا احاطہ نہیں کرتی بلکہ ان کے والد سجاد ظہیر کی زندگی کے بہت سے مخفی گوشوں کو ضرور سامنے لاتی ہے۔ نور نے اپنی زندگی کے ان چھوٹے چھوٹے واقعات کو جمع کر کے آپ بیتی کا نام دیا ہے جن کا بنیادی تعلق اس کے والدین سے بنتا ہے۔ سجاد ظہیر کا گھر چونکہ ترقی پسند تحریک کا مرکز تھا۔ اسی لیے وہاں ہندوستان بھر کے شعراء اور ادباء اکٹھے ہوتے۔ نور نے ان اجلاسوں میں ہونے والے مباحثوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اس لیے ''میرے حصے کی روشنائی'' میں ترقی پسند تحریک کے بہت سے مستند تاریخی شواہد محفوظ ہو گئے ہیں۔

اردو میں آپ بیتی کی تاریخ زیادہ طویل نہیں ہے لیکن ۱۸۷۶ء سے شروع ہونے والی اس صنف نثر میں بڑے وقیع اضافے ہو چکے ہیں۔ آج اردو ادب کا دامن متنوع اور ہمہ جہت شخصیتوں کی آپ بیتیوں سے مالا مال ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد صفدر رانا، اردو شعراء و ادباء کی خودنوشتیں ۱۹۹۰ء تک۔۔۔ تحقیق و تنقید کی روشنی میں، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۳ء ص ۱۵

۲۔ معین الدین عقیل ڈاکٹر، مقدمہ و تعلیقات بیتی کہانی، ادارہ علمی، حیدر آباد، ۱۹۹۵، ص ۲۵

۳۔ عصمت چغتائی، کاغذی ہے پیرہن، چوہدری اکیڈمی، گنپت روڈ، لاہور، س۔ن، ص ۱۳۳

۴۔ ایضاً، ص ۲۳۵

۵۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء ص ۲۷۶

۶۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء ص ۵۴

۷۔ قرۃ العین حیدر، کار جہاں دراز ہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء ص ۱۶

۸۔ رضیہ بٹ، بچھڑے لمحے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء ص ۱۲۷

۹۔ ایضاً، ص ۴۳۷

۱۰۔ نثار عزیز بٹ، گئے دنوں کا سراغ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء ص ۱۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۱۶